© rasailojaraid.com

مسلمان حکومتوں کے اتحاد کی تحریک

ابوالاعلیٰ مودودی

(یہ ایک تقریر ہے جو ۱۵، اکتوبر ۶۶ء کو بی این آر آڈیٹوریم میں موتمر عالم اسلامی کے زیر اہتمام ایک جلسہ میں کی گئی تھی۔)

الحمد للہ العلی العظیم، والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

جناب صدر اور معزز حاضرین، موجودہ صدی کے ابتدائی دور میں دنیا پر جو اجتماعی فلسفہ چھایا ہوا تھا، وہ نیشنلزم کا فلسفہ تھا۔ لوگوں کے ذہن میں انسان کی قومی و اجتماعی زندگی کا کوئی تصور اس کے سوا نہ آتا تھا کہ ہر قوم نہ صرف یہ کہ آزاد و خود مختار ہو بلکہ اس کا ایک ایک فرد اپنی قومیت کا پرستار بھی ہو، دوسری قوموں کو اپنی قوم کے مقابلے میں پست تر رکھنے کی کوشش کرے؛ اور اپنی قوم کو تمام قوموں پر بالاتر اور غالب کرنے کے لیے جان لڑا دے۔ لوگ اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ اجتماعی زندگی کی اگر کوئی معراج ہے تو وہ قومی ریاست (NATION STATE) ہے جس کو خدا کا مقام قوموں نے دے دیا تھا۔

اس تصور کا نقصان عظیم سب سے پہلے ۱۹۱۴ء کی جنگ میں ساری دنیا نے دیکھا۔ اپنی اپنی قومیتوں کے پرستار جب اس جذبے کے ساتھ اٹھے کہ اپنی قوم کو دنیا پر غالب کرنا ہی انسان کی زندگی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ اور جب انہوں نے اپنی قومی ریاست کو اپنا معبود اور اپنا الٰہ بنا کر یہ سمجھ لیا کہ اس معبود کے لیے ہر قسم کی قربانیاں دینا ہی انسانیت کی معراج ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک کی جنگ میں مختلف قومیں ایک دوسرے کے لیے درندوں سے بدتر ہو گئیں۔ آبادیوں کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آبادیوں کو تباہ کر ڈالا گیا۔ ملک کے ملک غارت کر دیئے گئے۔ اخلاق اور تہذیب اور آدمیت کی ساری اقدار پامال کر کے رکھ دی گئیں۔

اپنے اس فلسفے کا یہ ثمرہ جب دنیا نے دیکھ لیا تو پہلی مرتبہ یہ تخیّل جنگِ عظیم اوّل کے بعد اُبھرنا شروع ہوا کہ قوموں کے درمیان اتحاد کی کوئی ایسی شکل پیدا کی جائے جس میں ہر قوم اپنی قومی حاکمیت سے کچھ نہ کچھ دست بردار ہو اور مختلف قومیں مل کر ایک مرکزی اقتدار وجود میں لائیں جو قوموں کو تصادم سے بچاتے اور ان کے درمیان مصالحت و موافقت کی صورتیں نکالے۔ اس غرض کے لیے لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) قائم کی گئی۔ لیکن جس روز وہ وجود میں آئی اُسی روز یہ معلوم ہو گیا کہ "بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند"۔ اسی روز سے اس نے ملکوں کے حصے بخرے کرنے شروع کر دیئے اور مختلف قوموں کو بڑی بڑی سلطنتوں کے انتداب (MANDATE) میں دینے کا ایک نرالا طریقہ ایجاد کر لیا، جس کا مطلب یہ تھا کہ اب کمزور قوموں پر حملے کر کے ملک فتح نہ کیے جائیں گے بلکہ لیگ آف نیشنز اُن کو تحفے کے طور پر بڑی قوموں کے حوالے کیا کرے گی۔ اسی زمانے میں فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا تصور پیدا ہوا اور دنیا بھر سے یہودیوں کو لا کر اس سرزمین میں بسایا جانے لگا جو خالی پڑی ہوئی نہ تھی بلکہ صدہا برس سے اہلِ عرب اس میں آباد چلے آ رہے تھے۔ یہ گویا سامان تھا قوموں کے باہمی تصادم کو روکنے کا اور ان کے درمیان موافقت پیدا کرنے کا۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ انسان نے پہلی جنگِ عظیم کے تلخ تجربے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا، بلکہ اس تجربے کو اور اس تجربے کے متعلق جو باتیں دنیا کے اہلِ فکر کر رہے تھے، ان کو محض دھوکہ اور فریب دینے کا ایک ذریعہ بنا لیا گیا۔ بظاہر نام یہ لیا گیا کہ ہم قوموں کے درمیان موافقت پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن درحقیقت وہی نیشنلزم اپنے پورے زور شور کے ساتھ قوموں کے ذہنوں پر چھایا رہا۔ اور اسی پر قوموں اور ملکوں کی پالیسیاں مبنی رہیں۔

امن و صلح اور بین الاقوامی انصاف کے سارے دعووں کے باوجود اکیس سال تک کمزور قوموں کے حقوق پر ڈاکے پڑتے رہے، دنیا کے ہر گوشے میں فساد کے بیج بوتے جاتے رہے، اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلحہ فراہم کرنے کا سلسلہ اتنے بڑے پیمانے پر جاری رہا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ آخر کار دوسری جنگِ عظیم ہوئی جو پہلی جنگِ عظیم سے بھی زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ اس میں کروڑوں انسان تباہ کر دیئے گئے۔ ملک کے ملک غارت کر دیئے گئے۔ پوری پوری قوموں کو ان کے وطن سے اکھاڑ کر دوسرے علاقوں میں دھکیل دیا گیا۔ پورے پورے ملکوں کی آبادیاں اسیرانِ جنگ میں تبدیل ہوگئیں اور انسان نے انسان پر وہ ظلم ڈھائے جنہوں نے وحشی درندوں کو شرما دیا۔

اس دوسری جنگِ عظیم کے بعد دنیا کو پھر یہ خوشخبری سنائی گئی کہ اب قوم پرستی کی ماری ہوئی انسانیت کو بین الاقوامی انصاف سے بہرہ ور کیا جائے گا، چنانچہ اس غرض کے لیے "اقوامِ متحدہ" کو جنم دیا گیا، انسانی حقوق کا منشور بنانے کی باتیں کی گئیں، اور ایک سیکیورٹی کونسل بنائی گئی تاکہ وہ دنیا میں امن قائم کرے۔ لیکن آپ سبھی کو معلوم ہے کہ وہ سیکیورٹی کونسل کیسا امن قائم کر رہی ہے۔ پچھلے ہی سال ہمیں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ کشمیر کے متعلق اس کی قراردادیں ۱۷ سال سے دنیا کا منہ چڑا رہی ہیں۔ فلسطین سے دس لاکھ آدمی اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے گھروں سے نکالے جا چکے ہیں اور ان کی جگہ زمین کے ہر کونے سے لائے ہوئے یہودیوں کا قومی وطن بنایا گیا ہے۔ قبرص میں ترک اقلیت کو اس کی آنکھوں کے سامنے فنا کر دینے کی تدبیریں کی جا رہی ہیں۔ رہوڈیشیا، انگولا، جنوبی افریقہ، ویت نام اور دوسرے بہت سے مقامات پر کھلم کھلا ظلم اور بے انصافیاں جاری ہیں اور "اقوامِ متحدہ" ان کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ رہا انسانی حقوق کا منشور، تو آج تک قوموں نے اس کی پابندی کا اقرار نہیں کیا، کسی ملک نے اس کو اپنے قوانین میں جگہ نہیں دی، کوئی ادارہ ایسا وجود میں نہیں آیا جس سے وہ اشخاص، گروہ یا قومیں رجوع کر سکیں جن کے انسانی حقوق پر دست درازی کی گئی ہو۔

یہ حالات ہیں جن کو دیکھ دیکھ کر امن اور سلامتی اور انصاف کی ان بین الاقوامی ایجنسیوں سے دنیا مایوس ہوتی جا رہی ہے اور اب موجودہ زمانے کے مفکرین بڑے زور شور سے اس خیال کو پیش کرنے لگے ہیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ کم از کم ذہن و فکر کی دنیا میں یہ بات اب مسلّم ہو چکی ہے کہ قوم پرستی اور قومی ریاستوں کی معبودیت دنیا کے مصائب کی جڑ ہے اور انسانیت کو اس وقت تک امن نصیب نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو سکتا جب تک کہ مطلق العنان قومی ریاستوں کی جگہ ایک عالمی ریاست (WORLD STATE) وجود میں نہ آجائے۔ تمام دنیا کی ایک حکومت ہو۔ مختلف قوموں کو اس میں داخلی خود مختاری حاصل رہے۔ ان کے مذہب، ان کی تہذیب، ان کے تمدن، ان کی زبان کے لیے اس میں پورا تحفظ موجود ہو۔ مگر یہ قومیں ان بلنڈھوں کی طرح نہ رہیں جو ہر وقت ایک دوسرے سے ٹکرانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ بلکہ کوئی ایک طاقت ایسی ہو جو دنیا کے معاملات کو درست رکھے اور قوموں کے درمیان صحیح طور پر ان کے حقوق تقسیم کرے۔

لیکن یہ محض ایک تخیل ہی تخیل ہے۔ ایک خوشنما اور پاکیزہ خواہش سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا کوئی نظریہ دنیا کے پاس ایسا ہے جو واقعی ایک عالمی ریاست (ورلڈ اسٹیٹ) کو وجود میں لاسکتا ہو؟ کیا عیسائیت اس کی بنیاد بن سکتی ہے؟ کوئی عیسائی صاحب اگر یہاں موجود ہوں تو میں ان سے معذرت چاہتا ہوں، لیکن حقیقت تو حقیقت ہی ہے۔ عیسائیت نے سرے سے اسٹیٹ ہی کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی ہے، ورلڈ اسٹیٹ کا کیا سوال۔ وہ تو پہلے ہی قیصر کے حق میں جہانبانی سے دست بردار ہو چکی ہے۔ اور جہاں تک نوع انسانی کو متحد کرنے کا تعلق ہے عیسائیت نے اس مسئلے سے دلچسپی ضرور لی ہے مگر وہ اس معاملے میں کبھی کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ اس وقت بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ امریکہ کے نیگرو باشندوں کی عظیم اکثریت اگرچہ عیسائی ہے اور اس کا وہی دین ہے جو امریکہ کی سفید فام نسل کا ہے لیکن باوجود اس کے کہ دونوں میں عیسائیت مشترک ہے دونوں کے نام ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، دونوں کی تہذیب ایک ہے، پھر بھی وہ ایک چرچ میں جمع نہیں ہو سکتے، ایک بنچ پر ساتھ ساتھ بیٹھ نہیں سکتے، ایک میز پر کھانا ایک ریستوران تک میں کھا نہیں سکتے، ایک بس میں سوار نہیں ہو سکتے ایک محلے میں رہ نہیں سکتے۔ کہیں گوروں کے علاقے میں کوئی کالا خاندان آبسے تو اس کے گھر پر گولیاں برسائی جاتی ہیں اور کالوں کے بچے گوروں کے بچوں کے ساتھ ایک مدرسے میں پڑھنے چلے جائیں تو بچوں کی ٹانگیں توڑ دی جاتی ہیں۔ یہی صورت حال افریقہ میں ہے۔ جنوبی افریقہ میں گورے عیسائیوں کی اقلیت کالی اکثریت کے ساتھ خود اس کے اپنے وطن میں جو کچھ کر رہی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بلکہ براعظم افریقہ میں تو عیسائیت کا عجیب کرشمہ یہ دیکھا گیا ہے کہ کلیسا اگر کالوں کا ہے تو اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی کالی ہے اور گوروں کا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تصویر بھی گوری ہے۔ گویا دو عیسیٰ وجود میں لے آئے گئے ہیں کالوں کا عیسیٰ کالا اور گوروں کا عیسیٰ گورا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ دین کسی عالمی برادری اور کسی عالمی ریاست کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

پھر کیا بدھ ازم اس کی بنیاد بن سکتا ہے؟ اس کا حال تو یہ ہے کہ دنیا اور اس کے معاملات اور اس کی ریاست کے مسائل سے عیسائیت کی بہ نسبت بھی اس نے زیادہ بے تعلقی برتی ہے۔ اس کا پورا لٹریچر اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ اس میں انسانی معاملات کو چلانے کے لیے کوئی ہدایت موجود نہیں ہے وہ جو کچھ بھی ہدایت انسان کو دیتا ہے اس غرض کے لیے دیتا ہے کہ دنیا کے اس عذاب خانے سے جس میں کسی نہ کسی طرح وہ آکر پھنس گیا ہے، اور جسم کے اندر انسانی روح کی گرفتاری سے جس میں وہ مبتلا ہو گئی ہے، اس کو رہائی دلوائی جائے۔ گویا دنیا چلانے اور اس کے معاملات کا انتظام کرنے کے لیے وہ کوئی ہدایت نہیں دیتا، بلکہ دنیا سے فرار کرنے کے لیے اور جسم انسانی کی قید سے نکلنے کے لیے وہ راستے بتاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ دین بھی کسی عالمی معاشرے اور ریاست کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

اب کیا ہندو ازم وحدت انسانی کے لیے کوئی بنیاد فراہم کرتا ہے؟ اس نے تو انسانیت کو جمع کرنے کا نہیں بلکہ اسے پھاڑنے اور تقسیم کرنے کا پروگرام دیا ہے، اور اس کے اس پروگرام نے انسانیت کو ایسی بے دردی کے ساتھ پھاڑا ہے جس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی معاشرے میں نہیں ملتی تاریخ میں آپ کو مفتوحین کے ساتھ فاتحوں کے ظلم و ستم کی بد سے بدتر مثالیں ملیں گی، مگر اس ظلم کی کوئی مثال نہ ملے گی کہ ایک قوم باہر سے آکر ملک کو فتح کرنے کے بعد اس کے قدیم باشندوں کو چوہڑے اور چنڈال بنا کر رکھ دے، بیت الخلا صاف کرنے کی خدمت اس کے لیے مخصوص کرے، اسے پیدائشی طور پر ناپاک اور اچھوت قرار دے دے، اور بچے بچے کے دل و دماغ میں یہ فلسفہ گہرا اتار دے کہ اپنے پچھلے جنم کے اعمال کی پاداش میں یہ پیدا ہی ذلیل و خوار ہوئے ہیں اور اس پیدائشی ذلت سے کوئی ان کو نہیں نکال سکتا۔ دنیا میں صرف آریہ ہی وہ نسل ہے جس نے ہندوستان میں اپنے مفتوحوں کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ انہوں نے انسان اور انسان کے درمیان تفریق اور نسل پر نسل کی برتری کے تخیل کو محض کاغذی فلسفے تک محدود نہیں رکھا، بلکہ معاشرے کی عملی زندگی میں اسے آخری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حد تک پہنچا کر چھوڑا ہے۔ اس تفریق و امتیاز کے لیے آپ کو منو کی دھرم شاستر پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اسے آپ ہندو سوسائٹی میں ہر وقت، ہر جگہ پوری شدت کے ساتھ کارفرما دیکھ سکتے ہیں۔ جنوبی ہند میں تو یہ تفریق اس حد کو پہنچی ہے کہ اگر کوئی شودر بیمار ہو اور کسی برہمن ڈاکٹر کو اس کے علاج کے لیے جانا پڑے تو ڈاکٹر چالیس قدم کے فاصلے پر آکر رک جائے گا، بیچ میں ایک اینٹ ڈال دیگا۔ بیمار اینٹ کو مخاطب کر کے کہے گا کہ مجھے یہ تکلیف ہے اور ڈاکٹر اینٹ کو مخاطب کر کے بتائے گا کہ تیرا یہ علاج ہے۔ شودروں کی مختلف اقسام کے لیے مختلف فاصلے ہیں جن سے کم فاصلے پر کوئی شودر برہمن کے قریب چلا جائے تو برہمن ناپاک ہو جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ سوسائٹی اور یہ تمدنی و معاشرتی نظام اور یہ فلسفۂ زندگی اور نظریۂ حیات کبھی انسانوں کو جمع نہیں کر سکتا۔ یہ تو انسانوں کو پھاڑنے والا ہے نہ کہ جمع کرنے والا۔ حد یہ ہے کہ ہندوازم میں اگر کوئی آدمی بحری سفر کرے تو اس کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ پنڈت مدن موہن مالویہ جیسا پڑھا لکھا آدمی جب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں گیا تو واپس آکر اس کو بڑے بڑے کفارے ادا کرنے پڑے کیونکہ بحری سفر سے اس کا دھرم برہمنوں کے نزدیک بھرشٹ ہو چکا تھا۔ اس نظریے کی بنیاد پر کون سوچ سکتا ہے کہ وحدتِ انسانی کے قیام کا بھی کوئی امکان ہے؟

اسی طرح سے مغربی تہذیب بھی انسانوں کو جمع نہیں کر سکتی۔ وہی تو قوم پرستی کا فتنہ دنیا میں اٹھانے والی ہے۔ اسی نے تو انسانوں کو نیشنلزم کی بیماری میں مبتلا کیا۔ اسی نے تو نیشن اسٹیٹ کو خدا کا مقام دیا۔ وہی تو حیاتِ دنیا کی زینت اور معیارِ زندگی کی بلندی اور مادی خوشحالی کو انسان کا آخری مقصود اور اس کی کوششوں کی غایت الغایات بناتی ہے۔ اس مقصدِ حیات کو اختیار کر لینے کے بعد یہ فطری امر ہے کہ افراد افراد کے مقابلے میں، طبقات طبقات کے مقابلے میں اور قومیں قوموں کے مقابلے میں اس کی خاطر کشمکش کریں اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مادی زندگی کے منافع سمیٹنے کے لیے ہاتھ پاؤں ماریں۔ یہ تہذیب کبھی کوئی ایسا نظریہ لا کر آپ کو نہیں دے سکتی جو انسانوں کو جمع کر سکے، ان کے درمیان صلح اور صفائی پیدا کر سکے اور قوموں کو تصادم کے بجائے تعاون کی راہ پر لگا سکے۔ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پھاڑنے والی تہذیب ہے جمع کرنے والی تہذیب نہیں ہے۔ اس تہذیب کے زیر اثر پہلے تو محض حیوانی جبلت کے تحت انسان انسان کا شکار کرتا رہا۔ اہلِ مغرب اِسی مقصد کو لے کر امریکہ میں گھسے اور ریڈ انڈینس کی پوری نسل کا قلع قمع کر کے ان کے ملک پر قبضہ کیا۔ افریقہ میں گھسے اور وہاں سے دس بارہ کروڑ غلام لے جا کر انہوں نے اپنے مقبوضات کی آباد کاری کے لیے مویشیوں کی طرح ان سے کام لیا۔ مگر بعد میں انہوں نے ایک مستقل فلسفہ اس کے لیے بنا لیا جس کی بنا پر وہ اپنے اس طرز عمل کو سراسر حق بجانب اور عین تقاضائے فطرت سمجھنے لگے۔ اس فلسفے کی رُو سے یہ دنیا ہے ہی ایک رزم گاہ جس میں تنازع للبقاء (STRUGGLE FOR EXISTENCE) کا عمل جاری ہے۔ یعنی اس کائنات میں زندگی کی بنیاد نزاع پر قائم ہے نہ کہ موافقت پر۔ اس نزاع میں فطرت اُس کو باقی رکھتی ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں زندہ رہنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کا فطری ضابطہ ہے اور اسی ضابطہ کے مطابق دنیا میں زندگی کے لائق انواع کا انتخاب ہو رہا ہے، یعنی کمزور کا مٹ جانا اور طاقت ور کا باقی رہنا ہی فطری انتخاب (NATURAL SELECTION) ہے۔ اس نئے فلسفے نے مغربی تہذیب کے پیروؤں کو مطمئن کر دیا کہ اگر وہ کمزور قوموں کو مٹا کر یا دبا کر زمین سے بے دخل کر دیں اور ان کی جگہ خود زمین پر قبضہ کر کے مادی ترقی کے شاندار کرشمے دکھائیں تو یہ کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ نظامِ فطرت یہی کچھ چاہتا ہے اور زمین و آسمان اسی "عدل" پر قائم ہیں۔ یہی فلسفہ اور یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر آج کسی گورے کے ضمیر میں اس بات پر کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی کہ امریکہ میں گوری نسل نے ریڈ انڈین نسل کو فنا کر کے اس کی زمین پر قبضہ کر لیا۔ اسی فلسفے کی بنیاد پر آج دنیا کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ فلسطین میں عرب کوئی ترقی نہیں کر رہے تھے اور یہودیوں نے وہاں جا کر مادی ترقی کے یہ کچھ کمالات دکھاتے، لہٰذا اگر عربوں کو مار مار کر اس ملک سے نکال دیا گیا اور ان کی جگہ دنیا بھر سے لا لا کر یہودیوں کو بسا دیا گیا تو یہ قطعاً کوئی ظلم نہ تھا بلکہ یہ تو عین تقاضائے فطرت تھا۔ یورپ اور امریکہ میں آج اسی استدلال سے اسرائیل کے قیام کو حق بجانب ثابت کیا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ فلسفہ جس تہذیب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ہو، کیا وہ بھی کبھی وحدتِ انسانی کی بنیاد بن سکتی ہے؟

اب ذرا مارکسزم کو دیکھیے کیا وہ انسانیت کو جمع کر سکتا ہے؟ شاید وہ اسے اسی وقت جمع کر سکے جب اس کے تصور کے مطابق پوری نوعِ انسانی میں بس ایک ہی طبقہ باقی رہ جائے گا لیکن جب تک وہ پہلے طبقاتی نزاع برپا کر کے پوری دنیا کو خاک و خون میں کمانہیں لے گا اس وقت تک وہ اپنے اس نصب العین تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کبھی اس تک پہنچے گا بھی یا نہیں مگر اس کو پہنچنے کے لیے جس راستے سے وہ گزر رہا ہے اور آگے گزرنا چاہتا ہے وہ عالمگیر جنگِ طبقات ہے جس کے ذریعہ سے مار دھاڑ، توڑ پھوڑ، اور خونی انقلابات برپا کر کے پہلے تو وہ مزدور طبقے کی ڈکٹیٹر شپ قائم کریگا پھر صاحبِ ملکیت طبقات کو فنا کریگا، ان کی املاک چھینے گا، ان کو قتل کر کے یا جلاوطن کر کے یا دوسرے کسی طریقے سے ان کا استیصال کریگا تب کہیں انسان کو وہ جنت نصیب ہوگی جس میں روئے زمین پر نوعِ انسانی کا بس ایک ہی طبقہ موجود ہوگا۔ یہ عمل ابھی روس اور چین میں بھی مکمل نہیں ہوا ہے اس کے بعد نہ معلوم ساری دنیا میں کتنا کچھ توڑ کر اور پھر بنا کر کتنی مدت میں یہ تکمیل کو پہنچے گا۔ کم از کم آئندہ دس بیس نسلوں کو تو اس سے جمع کی نہیں بلکہ ضرب و تفریق ہی کی امید رکھنی چاہیے۔ آج کی دنیا جو امن چاہتی ہے بہرحال مارکسی نظریہ و فلسفہ وہ اس کو نہیں دے سکتا۔

اس کے بعد اگر میں یہ کہوں تو ہرگز غلط نہ کہوں گا کہ اسلام کے سوا ایسا کوئی نظریہ نہ اس سے پہلے تھا نہ اب ہے جو انسانیت کو جمع کر سکے اور ایک عالمی ریاست کی بنیاد بن سکے۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جو پوری نوعِ انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہے اور تمام انسانوں کو خطاب کر کے کہتا ہے کہ تم سب اصل میں ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہو۔ یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی "لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے"۔ پھر وہ ان سے کہتا ہے کہ تمہارے خالق کی بنائی ہوئی فطرت نے تم کو قوموں اور قبیلوں کی شکل میں اس لیے تقسیم نہیں کیا کہ تم آپس میں لڑو بلکہ اس لیے کیا ہے کہ تم آپس کی جان پہچان سے ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ آسانی سے تعاون کر سکو۔ یہ تقسیم تعارف کے لیے ہے، تصادم کے لیے نہیں ہے۔ وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا "ہم نے تم کو اقوام اور قبائل اس لیے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو"۔ جہاں تک انسانوں کے قوموں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور قبیلوں اور خاندانوں میں تقسیم ہونے کا تعلق ہے یہ ایک امر فطری ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی خاندان میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے قریب ترین لوگ اس کے خاندان ہی کے لوگ ہوتے ہیں جن سے وہ سب سے پہلے متعارف ہوتا ہے۔ پھر ایک شہر یا ایک بستی میں جو خاندان آباد ہوں وہ آپس میں دوسری بستیوں کی بہ نسبت زیادہ تعارف اور میل جول کے مواقع رکھتے ہیں۔ اور ایسا ہی معاملہ خاندانوں کے اُس مجموعے کا بھی ہے جن سے مل کر ایک قوم بنتی ہے۔ انسانوں کے درمیان ربط اور تعامل کی یہی ایک فطری صورت ہے اس لیے انسانوں کے خالق نے اُن کو اقوام اور قبائل کی شکل میں جمع کیا ہے۔ اس کا مقصد باہمی تعارف اور تعاون کے لیے ایک بنیاد فراہم کرنا ہے نہ یہ کہ ایک خاندان، یا نسل یا قوم کے لوگ دوسرے لوگوں کو ذلیل و خوار سمجھیں، ان پر اپنا فخر جتائیں، ان کو دبا کر خود اُن کے سر پر سوار ہو جائیں اور آخر کار اسی کے نتیجے میں قوموں کی وہ آویزش رونما ہو جو خدا کی زمین کو ظلم و فساد سے بھر دیتی ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ فضیلت کی حقیقی بنیاد کسی خاندان، نسل یا قوم میں پیدا ہونا نہیں ہے بلکہ اخلاق کے اعتبار سے بلند اور پاکیزہ تر ہونا ہے۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ "تم میں سب سے زیادہ ذی عزت وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے"۔

یہ ہے انسانیت کا وہ تصور جو دنیا کے تمام انسانوں کو جمع کر سکتا ہے اور ان کو ایک برادری بنا کر ایک عالمی معاشرہ اور ریاست قائم کر سکتا ہے۔ آدمی آدمی کے ساتھ ایک سطح پر مل کر اسی وقت برادرانہ تعلق پیدا کر سکتا ہے جب ہر شخص یہ سمجھے کہ میں ایک خدا کا پیدا کیا ہوا ہوں، ایک ہی خدا کے سامنے جواب دہ ہوں۔ ایک ہی خدا میرا اور تمام انسانوں کا خالق اور رب ہے، ایک ہی مادے سے میری اور دوسرے سب انسانوں کی ہڈی بوٹی بنی ہے۔ اور ہم میں سے کوئی بھی اس وجہ سے اچھا یا بُرا نہیں ہے کہ وہ اتفاقاً کسی باپ کے نطفے اور کسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ اچھائی اور بُرائی جو کچھ بھی ہے اخلاق اور اعمال کی ہے۔ اچھے اخلاق اور اچھے عمل جس کے بھی ہوں وہ قابلِ قدر ہے خواہ وہ مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔ اور بُرے اخلاق و اعمال جس کے بھی ہوں وہ کم تر درجے کا انسان ہے خواہ وہ کالا ہو یا گورا۔ یہی حقیقت ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تاریخی خطبۂ حجۃ الوداع میں بیان فرمایا تھا کہ نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی تفوق حاصل نہیں۔ نہ کسی گورے کو کالے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر یا کالے کو گورے پر کوئی فوقیت حاصل ہے ۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے ۔ تمہارے درمیان اگر کوئی شخص عزت والا ہے تو بس وہ جو اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے "۔

اسلام اس بات کو محض ایک نظریے اور فلسفے کے طور پر پیش کر کے نہیں رہ گیا ہے بلکہ عملاً اس نے ایک معاشرہ انہی بنیادوں پر وجود میں لا کر دکھا دیا ہے ۔ اس معاشرے میں اس نے مختلف ملکوں، نسلوں اور قوموں کو بالکل مساوی حیثیت سے جمع کر دیا ۔ نسل، رنگ، زبان اور قومیت کے سارے امتیازات مٹا دیئے ۔ ان کے درمیان اونچ نیچ اور چھوت چھات کی کوئی تفریق باقی نہیں رہنے دی ۔ ایک ہی مسجد میں وہ ایک ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے ۔ ایک دستر خوان پر کھانے لگے ۔ آپس میں شادی بیاہ کرنے لگے ۔ اور جملہ حقوق و فرائض میں ان کے درمیان پوری یکسانی پیدا ہو گئی ۔ آج جو لوگ اسلام کے بدترین مخالف ہیں ان کو بھی یہ ماننا پڑا ہے کہ دنیا میں اسلام کے سوا کوئی دین، کوئی مذہب، کوئی نظامِ تمدن و معاشرت ایسا نہیں ہے جو نسل و رنگ اور زبان و وطن اور قومیت کی تفریقوں کو مٹا کر انسانوں کی ایک عالمگیر برادری بنانے میں کامیاب ہوا ہو ۔ یہ صرف اسلام ہی کی برکت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کا کمال ہے اور قرآن مجید کی تعلیم کی حیرت انگیز معجزانہ تاثیر ہے کہ اس نے عملاً نوعِ انسانی کو اس طرح ایک امت بنا دیا ۔

پھر اسی نظریے کی بنیاد پر اسلام نے عملاً ایک عالمی ریاست بھی قائم کر کے دکھا دی ۔ خلافت راشدہ کے دور میں جب اسلام عرب سے نکل کر دنیا کے ایک بڑے حصے میں پھیلا تو دنیا کے تمام مسلمانوں کا ایک ہی امیر اور ایک ہی امام تھا ۔ تمام بلادِ اسلام میں ایک ہی قانون رائج تھا تمام مسلمان بالکل ایک برادری تھے ۔ مشرق سے مغرب تک دنیا کے کسی ملک میں جو شخص بھی اسلام قبول کرتا تھا وہ ٹھیک انہی حقوق کے ساتھ اسلامی معاشرے میں شامل ہو جاتا تھا جو عربوں کے حقوق تھے ۔ بلکہ حقوق میں اس کے اور ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ کے درمیان بھی کوئی فرق و امتیاز نہ تھا ۔ ایک حبشی، ایک رومی، ایک ایرانی، ایک قبطی، ایک بربری کلمۂ اسلام کا قائل ہونے کے بعد ٹھیک اسی صف میں آ کھڑا ہوتا تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے خاندان اور آپ کی اپنی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوم کے لوگ کھڑے تھے۔ اس کے واجبات وہی تھے جو ان کے تھے، اس کے حقوق وہی تھے جو ان کے تھے، اس کی حیثیت اور اس کا مرتبہ وہی تھا جو ان کا تھا۔ اور اپنے اوصاف کے لحاظ سے وہ اسلامی معاشرے اور ریاست میں بڑی سے بڑی فضیلت حاصل کر سکتا تھا۔

بعد کے ادوار میں اگرچہ مسلمانوں کے اندر بہت سی خرابیاں رونما ہوگئیں، مگر اسلام نے مسلمانوں کے اندر جو عالمگیر برادری پیدا کر دی تھی وہ اپنی جگہ قائم رہی، اس کو کوئی طاقت نہ مٹا سکی۔ مسلمانوں میں ہر طرح کے تفرقے برپا ہوتے، قومی و نسلی اور قبائلی اختلافات بھی ابھرتے رہے، ان کی ایک عالمگیر سلطنت کی جگہ بہت سی الگ الگ ریاستیں بھی بن گئیں، مگر یہ تخیل برابر قائم رہا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک امت ہیں، اور کلمۂ اسلام کا ماننے والا خواہ کسی وطن اور کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، خواہ کوئی زبان بولتا ہو، خواہ اس کی جلد کا رنگ کچھ ہی ہو، بہر حال وہ ہے مسلمانوں کا بھائی اور مسلم معاشرے میں وہ جہاں بھی چلا جائے اس کے حقوق وہی ہیں جو دوسرے سب مسلمانوں کے ہیں۔ اس تخیل کا یہ کرشمہ دنیا صدیوں تک دیکھتی رہی ہے کہ مشرق سے مغرب تک مسلمان جس ملک میں بھی چاہتا بے روک ٹوک جا سکتا تھا، جہاں چاہتا پھر سکتا تھا، جتنے دن چاہتا ٹھیر سکتا تھا، جو کاروبار چاہتا کر سکتا تھا، بڑے سے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہو سکتا تھا، اور شادی بیاہ میں بھی اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اسلامی تاریخ ایسی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ ایک مسلمان اپنے ملک سے نکل کر دنیا بھر کے مسلمان ملکوں میں سالہا سال تک پھرتا رہا ہے، کہیں اس نے علم حاصل کیا، کہیں اس نے تجارت کی، کہیں اس کو وزارت یا فوج کی سپہ سالاری مل گئی، کہیں وہ رہ پڑا اور اس نے شادی کر لی۔ اس کی ایک نمایاں مثال ابن بطوطہ ہے جس نے ۲۷ سال دنیا بھر کے مسلمان ملکوں میں پھر کر گزار دیئے اور کہیں اس کو پاسپورٹ یا ویزا کی ضرورت پیش نہ آئی۔ کہیں اس سے نہ پوچھا گیا کہ تیری قومیت کیا ہے، کہیں اسے اپنی معاش کے لیے وسائل فراہم کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئی، کہیں اسے اقامت کے لیے پرمٹ نہ لینا پڑا، کہیں اس کے قیام کے لیے کوئی مدت مقرر نہ کی گئی، بلکہ کسی جگہ اگر اس نے سرکاری ملازمت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنی چاہی تو وہ بھی بلا تکلف مل گئی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں وہ ہندوستان پہنچا ہے اور یہاں مراکش کے انتہائی سرے سے آیا ہوا وہ شخص مجسٹریٹ بنا دیا جاتا ہے، پھر سلطان اس کو اپنا سفیر بنا کر چین بھیج دیتا ہے، یعنی ڈپلومیٹک سروس تک میں اس کو داخل ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس وقت دنیا بھر کی مسلمان ریاستوں کے درمیان محض دولتِ مشترکہ (COMMON WEALTH) ہی کا نہیں بلکہ شہریتِ مشترکہ (COMMON CITIZENSHIP) کا تصور بھی پوری طرح کار فرما تھا۔ دنیائے اسلام حقیقت میں ایک دارالاسلام تھی اگرچہ اس کے مختلف حصوں میں الگ الگ حکومتیں پائی جاتی تھیں۔ اس دارالاسلام کی ہر حکومت کے لیے پوری اسلامی دنیا کی افرادی قوت (MAN POWER) قابلِ حصول تھی۔ ہر مسلمان ہر مسلم حکومت کا وفادار تھا۔ اور دارالاسلام کی حفاظت و مدافعت تمام مسلمانوں کی مشترک ذمہ داری تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک دنیائے اسلام میں ہم یہی کیفیت جاری و ساری پاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ دنیا کے اہلِ فکر آج جس عالمی ریاست کی تمنا ظاہر کر رہے ہیں، اسلام نے صرف یہی نہیں کہ اس کے لیے تمام فکری و نظری بنیادیں فراہم کر دی ہیں بلکہ صدیوں تک وہ عملاً اس کا مظاہرہ کرتا رہا ہے۔

لیکن اس بات پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ موجودہ دور میں مسلمان اپنی اس قیمتی متاع کی قدر و قیمت بھی فراموش کر گئے۔ مغربی قومیں جب اسلامی دنیا پر چھاپے مارتی ہوئی آگے بڑھیں اور ملک پر ملک فتح کرتی چلی گئیں تو پہلے تو ہم نے ان کی تلوار سے شکست کھائی، پھر ان کی تعلیم و تہذیب اور ان کے فلسفوں کے آگے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔ جو غضب ان کی تلوار نہ ڈھا سکتی تھی وہ ان کے فلسفوں نے ڈھا دیا۔ ان کا سیاسی غلبہ ہم پر وہ مصیبت کبھی نہ لا سکتا تھا جو ان کا تہذیبی اور فکری غلبہ لے آیا۔ سیاسی غلبے نے صرف ہمارے جسموں کو جکڑا تھا۔ اس تہذیبی غلبے نے ہمارے دل و دماغ تک بدل ڈالے۔ یہ اسی غلبے کے نتائج میں سے ایک منحوس نتیجہ ہے کہ مسلمانوں نے اہلِ مغرب کے اُس تصورِ قومیت کو قبول کر لیا جس سے وہ انیسویں صدی تک ناآشنا تھے۔ پھر اس قومیت کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساتھ انہوں نے قوم پرستی بھی انہی سے سیکھ لی جس کی بنا پر حکومتوں کی پالیسیوں کی بدولت ہر ملک اور ہر نسل کا مسلمان ایک بڑی حد تک اسلام کی بین الاقوامی برادری سے کٹ کر صرف اپنے ہی ملک اور اپنی ہی نسل کا آدمی بن کر رہ گیا۔ اس کی وفاداری اپنے ہی ملک تک محدود ہو گئی۔ اس کے حقوق بھی اپنے ہی ملک کے حدود میں محصور ہو گئے۔ دوسرے مسلمان ملک اس کے لیے ویسے ہی اجنبی اور غیر بن گئے جیسا کوئی غیر مسلم ملک ہو سکتا تھا۔ اور تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے اپنے ہاتھوں سے دارالاسلام کی وحدت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ جو قوم دنیا میں سب سے زیادہ انٹرنیشنلزم سے بعید ہو سکتی تھی، جو قوم دنیا میں اس حیثیت سے اٹھائی گئی تھی کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (تم وہ بہترین امت ہو جو تمام نوعِ انسانی کے لیے اٹھائی گئی ہے)، اُس نے کفار سے قوم پرستی کا سبق سیکھ کر اپنی اُس بین الاقوامی وحدت کے ٹکڑے اڑا دیئے جو اسلام کی بدولت اُسے مفت ہاتھ آگئی تھی، حالانکہ دوسرے اُسے دنیا بھر کی دولت خرچ کر کے بھی حاصل کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ۔

انیسویں صدی کے وسط سے اہل مغرب مسلمانوں کی اس وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے پیچھے پڑے ہوئے تھے اور انہیں قومیت کی پٹی پڑھا رہے تھے۔ اس کا پہلا خمیازہ ہم کو جنگ عظیم اول میں اس طرح بھگتنا پڑا کہ ایک مسلمان قوم نے دوسری مسلمان قوم کے خلاف عین اُس حالت میں بغاوت کر دی جب کہ وہ دشمنوں سے برسرِ جنگ تھی۔ اس میں قصور ایک کا نہ تھا بلکہ دونوں کا تھا۔ ایک نے اہلِ مغرب سے تورانی قومیت کا سبق سیکھا تھا اور دوسری نے انہی اہلِ مغرب سے عربی قومیت کا سبق سیکھ لیا تھا۔ ایک ہی استاد کے دونوں شاگرد تھے اور اس کی تعلیم نے دونوں کے ذہن سے یہ بات نکال دی تھی کہ ان کے درمیان اسلام کا بھی کوئی رشتہ ہے۔ ترک اِس بات کو بھول گئے تھے کہ جس سلطنت کو وہ لیے بیٹھے ہیں وہ اسلامی خلافت کی علمبردار ہے، اور اُس میں صرف تورانی نسل ہی آباد نہیں ہے، عرب اور دوسرے عناصر بھی آباد ہیں جو اسلام کے وفادار تو ہو سکتے ہیں مگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تورانیت کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ عرب اس بات کو بھول گئے کہ کافروں کے دکھائے ہوئے سبز باغ کے فریب میں آکر جن کے مقابلے میں وہ ہتھیار اٹھا رہے ہیں وہ ان کے اپنے ہی مسلمان بھائی ہیں اور جس آزادی کی امید دلا کر انہیں اپنے بھائیوں سے لڑایا جا رہا ہے وہ غلامی کا ایک دوسرا پھندا ہے جسے خود ان کے اپنے ہاتھوں سے ان کے گلے میں ڈالنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔ قومیت کے نشے نے یہ سب کچھ بھلا کر دونوں کو ایک دوسرے سے لڑا دیا اور اس کا نتیجہ اس بدترین صورت میں ہمارے سامنے آیا کہ ایک طرف ترکی سلطنت کے ٹکڑے اڑ گئے، ترکوں کے لیے خود اپنے وطن کی آزادی بچانی بھی مشکل ہو گئی، اور جب وہ کسی نہ کسی طرح اسے بچا لینے میں کامیاب ہو گئے تو جو بری بھلی خلافت صدیوں سے قائم چلی آ رہی تھی اسے انہوں نے خود ختم کر لیا، سلطنت کا رشتہ دین سے توڑ ڈالا، رسم الخط تک تبدیل کر دیا اور دنیائے اسلام سے اپنے سارے رشتے کاٹ کر بیٹھ گئے۔ دوسری طرف عربوں کو وہ آزادی نہ مل سکی جس کی خاطر وہ دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں میں کھیل گئے تھے۔ عراق پر انگریز قابض ہو گیا۔ شام اور لبنان پر فرانس مسلط ہو گیا۔ فلسطین انگریزوں کے انتداب (MANDATE) میں دے دیا گیا اور انہوں نے اسے یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا خمیازہ اِس قوم پرستی کا جو ہم نے پہلی جنگِ عظیم میں بھگتا۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد ہم پر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا فضل ہوا ہے کہ مشرق سے مغرب تک وہ بہت سی مسلمان قومیں آزاد ہو گئیں جو ایک مدت دراز سے مغربی استعمار کی غلامی میں مبتلا تھیں۔ اِن قوموں کی الگ الگ آزاد و خود مختار ریاستوں کا وجود میں آنا تو بہر حال تاریخی اسباب کا لازمی تقاضا ہے جسے ہم نہیں بدل سکتے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ یہ سب ریاستیں قومیت اور قوم پرستی کے انہی تصورات کی پیروی کر رہی ہیں جن کی تعلیم انہوں نے اپنے سابق مغربی آقاؤں سے حاصل کی تھی۔ دارالاسلام کی واحد قومیت، مشترک شہریت اور دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) کا تخیل تو دُور کی چیز ہے، ان کے اندر ابھی تک یہ شعور و احساس بھی پیدا نہیں ہو سکا ہے کہ ان کے درمیان اسلام کا ایک رشتہ موجود ہے جو انہیں اور ان کی مسلمان آبادیوں کو جمع کر سکتا ہے۔ انہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک دوسرے کا مددگار و خیر خواہ بنا سکتا ہے، ان کی باہمی ترقی کے لیے تعاون کی راہیں کھول سکتا ہے اور اپنی آزادی کے تحفظ کے لیے بھی وہ انہیں ایک دوسرے کا رفیق بنا سکتا ہے۔ قومیت کا مغربی تصور ان پر کچھ اس طرح چھایا ہوا ہے کہ وہ آج تک اپنی قوم سے باہر کے مسلمان کو ویسا ہی اجنبی اور غیر سمجھ رہی ہیں جیسا کوئی غیر مسلم ہو سکتا ہے۔ اپنے قومی مفاد کی خاطر دوسری مسلمان قوم سے لڑ جانے میں بھی انہیں کوئی باک نہیں ہے۔ ایک مسلمان قوم کے غیر مسلم دشمن کو دوست بنا لینے میں بھی انہیں کوئی تامل نہیں ہے۔ ایک مسلمان قوم پر ظلم و ستم کے پہاڑ بھی ٹوٹ جائیں تو ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اور آج وہ سب اس خطرے میں مبتلا ہیں کہ بین الاقوامی طاقتوں کے کسی عالمگیر تصادم میں وہ ایک ایک کر کے اپنی آزادی پھر نہ کھو بیٹھیں۔

ان حالات میں یہ ایک بڑی خوش آئند آواز اٹھی ہے کہ مسلمان حکومتوں کے سربراہ ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھیں۔ اپنے مشترک مسائل پر غور و فکر کریں اور انہیں حل کرنے کے لیے باہمی تعاون کی کوئی شکل نکالیں۔ عقل کہتی تھی کہ اس آواز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ مگر کان سن رہے ہیں اور آنکھیں دیکھ رہی ہیں کہ غیر مسلموں سے بھی بڑھ کر ہمارے اپنے مسلمان بھائیوں کو سرے سے اس آواز کا اٹھنا ہی ناگوار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب کے نام پر قومی ریاستوں کو جمع کرنا کیا معنی۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ بات وہ لوگ کہہ رہے ہیں جو ساتھ ہی ساتھ یہ نعرہ بھی بلند کرتے جاتے ہیں کہ اشتراکی انقلاب کی قائل ریاستوں کو مجتمع ہو جانا چاہیے۔ گویا اشتراکیت پر جمع ہونا تو حلال و طیب ہے، البتہ اسلام پر جمع ہونا حرام ہے۔ کسی جامع رشتے کی بنیاد پر اتفاق و اجتماع بجائے خود قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ مگر وہ رشتہ خدا کے دین کا نہیں، کارل مارکس کے دین کا ہونا چاہیے۔ یہ ہے مغربی مستعمرین کا وہ جادو جو اُن کی سیاسی غلامی سے آزاد ہو جانے کے بعد بھی اُن کے شاگردوں کے سر پر چڑھ کر بول رہا ہے۔ استاد چاہے مسیحیت کے تعصب پر مجتمع ہو کر مسلمان قوموں پر ظلم ڈھاتے رہے ہوں اور آج بھی ان کی دشمنی میں کسر نہ اٹھا رکھتے ہوں، مگر شاگرد کو جب انہوں نے یہ سکھا دیا کہ اسلام کے ساتھ تعلق کا اظہار ہی رجعت پسندی ہے تو وہ اس رجعیت کا مظاہرہ کر کے اپنی ترقی پسندی کو بٹہ کیسے لگا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکتا ہے۔

مسلمان حکومتوں کے اجتماع کی تجویز پر جتنے اعتراضات قریب کے زمانے میں میں نے سنے ہیں اُن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رہنماؤں اور مسلمان قوموں کے بڑے بڑے فرمانرواؤں کے دماغ بالکل اُلجھے ہوئے ہیں۔ وہ حقائق کو سیدھے اور صاف طریقے سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ مسلمان ریاستوں کے اجتماع پر اعتراض کی آخر کیا معقول وجہ ہو سکتی ہے جبکہ دنیا میں ایک برٹش کامن ویلتھ موجود ہے جس میں شریک ہونے والے ملکوں کے درمیان کوئی رشتہ اس کے سوا نہیں ہے کہ یہ سب ملک ایک وقت میں انگریز کے غلام رہ چکے ہیں؟ ان کی نہ تہذیب ایک ہے۔ نہ زبان ایک۔ نہ معاشی زندگی میں وہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور نہ ان کے درمیان کوئی جغرافی اتصال پایا جاتا ہے۔ پھر بھی اس برٹش کامن ویلتھ کے وجود پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اسی طرح افریقہ میں افریقی قوموں کی ایک تنظیم قائم ہے جس کے شرکاء میں رنگ کی سیاہی اور سفید فام اقوام کے مقابلے میں سیاہ رنگ لوگوں کے مفاد کی حفاظت کے سوا اور کوئی وجہ اشتراک نہیں ہے۔ اس تنظیم میں خود وہ لوگ بھی شریک ہیں جو مسلمان حکومتوں کے اتحاد پر آج سخت اعتراض کر رہے ہیں۔ پھر ایک اور اتحاد اشتراکی ملکوں کے درمیان وارسا پیکٹ کی شکل میں۔ اور ایک دوسرا اتحاد براعظم امریکہ کی ریاستوں کے درمیان ریاستہائے امریکہ کی تنظیم کی شکل میں موجود ہے۔ مگر ان تنظیموں اور اتحادوں پر آج کوئی معترض نہیں ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر مسلمان ریاستیں باہم جمع ہوں تو ان کے اجتماع پر کوئی اعتراض کرنے کا کیا حق رکھتا ہے؟ آخر کس اصول، کس نظریے، کس فلسفے کی رُو سے وہ اس پر اعتراض کر سکتا ہے؟ ان مسلمان قوموں کے درمیان پاکستان سے مراکو اور مغربی افریقہ تک جغرافی حدود مسلسل مشترک ہیں، اور اگر سمندر کے حائل ہونے کو جغرافی اتصال میں مانع نہ سمجھا جائے تو انڈونیشیا اور ملیشیا بھی اس اشتراک میں شامل ہیں۔ ان کے درمیان صرف مذہب ہی کا ایک رشتہ نہیں ہے، تمدن اور تہذیب کا رشتہ بھی موجود ہے۔ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک چلے جائیے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک مشترک تہذیب ہے جس کے چند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بنیادی اصول ہر جگہ یکساں جاری و ساری ہیں۔ میں خواہ کسی ملک میں جاؤں اذان کی آواز میرے کان میں آتے ہی فوراً مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں میرے اپنے بھائی موجود ہیں اور ایک مسجد بھی یہاں ضرور پائی جاتی ہے جس کی جماعت کا میں بھی ویسا ہی ایک ممبر ہوں جیسا اس ملک کے باشندوں میں سے کوئی شخص ہو سکتا ہے۔ میں جا کر اس میں شریک ہوتا ہوں تو وہاں کوئی مجھے اجنبی نہیں سمجھتا، بلکہ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں ایک دوسرے مسلمان ملک سے آیا ہوں مسجد کے مقامی حاضرین دوڑ دوڑ کر آتے ہیں اور محبت سے مجھے گلے لگاتے ہیں۔ میں ان کی زبان سے واقف نہیں ہوں، مگر السلام علیکم میرے اور ان کے درمیان مشترک ہے۔ خطبے اور نماز کی زبان میرے لیے بیگانہ نہیں۔ الحمد للہ رب العالمین اور اللہ اکبر پر میرے اور ان کے درمیان پورا اتفاق ہے۔ نماز کی شکل اور ہیئت انڈونیشیا سے لے کر مراکو تک ایک ہی ہے۔ جماعت کے لوگ مجھ اکیلے اجنبی کو بھی امام بنا سکتے ہیں، اور میں اکیلا اجنبی ان کے امام کے پیچھے بھی نماز پڑھ سکتا ہوں۔ مسجد سے نکل کر میں اس ملک کی مسلم سوسائٹی میں جہاں بھی جاؤں یہی محسوس کرتا ہوں کہ میرے اور ان کے درمیان تہذیب و ثقافت کا بہت بڑا اتحاد موجود ہے۔ میں ہر جگہ ان کے ساتھ بیٹھ کر اس اطمینان کے ساتھ کھانا کھا سکتا ہوں کہ جن چیزوں کو میں حرام سمجھتا ہوں یہ بھی انہیں حرام سمجھتے ہیں اور پاکی و طہارت کے جن قواعد کا میں قائل ہوں، یہ بھی ان کے قائل ہیں۔ پھر جس مسلمان ملک میں بھی میں جاتا ہوں، اس کے خواص ہی نہیں عوام تک بازاروں اور بسوں اور ہوٹلوں میں جب مجھ سے ملتے ہیں تو میرے ملک کے مسلمانوں کی خیریت اس طرح پوچھتے ہیں جیسے ایک کنبے کے لوگ اپنے رشتہ داروں کی خیریت دریافت کرتے ہیں۔ اچھے حالات سنتے ہیں تو الحمد للہ کہتے ہیں اور خوشی ان کے چہروں پر چمک رہی ہوتی ہے۔ برے حالات سنتے ہیں تو اس پردیسی ہی غمگین ہوتے ہیں جیسے میرے اپنے ملک کے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان تمام ملکوں کے درمیان نکاح و طلاق و وراثت کے قوانین اس قدر ایک دوسرے سے قریب ہیں کہ ان کے درمیان باہمی ازدواج تک میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ یہ کیفیت دنیا کی کسی دوسری قوم کے ملک میں جا کر مجھے کہیں اور کبھی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے درمیان جذبات کا، ہمدردی و خیر خواہی کا، تہذیب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور ثقافت کا ایک گہرا اور مضبوط رشتہ موجود ہے جسے آج اس قوم پرستی کے جنون کے دور میں بھی کوئی چیز توڑ نہیں سکی ہے۔ اور اس کے ساتھ جغرافی حیثیت سے بھی ہمارے ملک ایک دوسرے سے از شرق تا غرب متصل ہیں۔ پھر آخر کیوں نہ ہم اپنے مشترک مسائل کو حل کرنے اور ایک دوسرے کی ترقی میں مددگار بننے کے لیے باہم مجتمع ہوں؟ اس پر مزید ایک وجہ ہمارے اجتماع کے لیے یہ بھی ہے کہ جس جغرافی علاقے میں ہمارے ملک واقع ہیں اسے بڑی طاقتوں کی بین الاقوامی کشمکش کے تباہ کن اثرات سے ہمارا ایک ایک ملک اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ اس لیے ہمارا متحد ہونا ویسا ہی ضروری ہے جیسا افریقی قوموں کے لیے استعماری طاقتوں کی دستبرد سے بچنے کی خاطر متحد اور منظم ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ اگر رنگ کا اشتراک۔ اور جغرافی اتصال اور ایک مشترک مفاد کا موجود ہونا، اُن کے متحد اور منظم ہونے کے لیے جائز اور معقول وجہ ہے جس کی بنا پر افریقی قوموں کی تنظیم پر کسی کو اعتراض نہیں ہے، تو اس سے بدرجہا زیادہ گہرے رشتوں کی بنا پر ایک مشترک مقصد کے لیے ہمارا اتحاد کیوں جائز اور معقول نہیں ہے اور کس بنا پر کوئی صاحبِ عقل آدمی اس پر اعتراض کر سکتا ہے؟

جو حضرات مذہب کی بنیاد پر مسلمان ملکوں کے متحد ہونے کی مخالفت کرتے ہیں ان سے میں پوچھتا ہوں کہ جب مذہبی تعصب ہی اُس ظلم اور زیادتی کی بنیاد ہو جو مغربی قومیں دنیا میں ہر جگہ مسلمانوں پر کر رہی ہیں تو آخر اس سے اپنا بچاؤ کرنے کے لیے وہ لوگ کیوں نہ متحد ہوں جو اِس تعصب کے شکار ہو رہے ہیں؟ مغربی قومیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اُس تعصب کو آج تک دل سے نہیں نکال سکی ہیں جو صلیبی لڑائیوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ آپ خواہ ان سے مذہبی رواداری کے کتنے ہی سبق سیکھیں اور مذہبی حیثیت سے اپنے آپ کو کتنا ہی بے حس ثابت کر کے ان کی نگاہ میں سُرخ رو بننے کی کوشش کریں۔ وہ نہ آپ کے مسلمان ہونے کو معاف کر سکتے ہیں۔ اور نہ آپ کو اس کی سزا دینے میں کوئی کسر باقی چھوڑ سکتے ہیں۔ وہ صرف خود ہی ظلم نہیں کرتے بلکہ دنیا میں جہاں بھی مسلم اور غیر مسلم کے درمیان کوئی جھگڑا ہو، ان کی ہمدردیاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غیر مسلم کے ساتھ ہی ہوتی ہیں خواہ وہ کتنا ہی بڑا ظالم ہو اور مسلمان کیسا ہی سخت مظلوم ہو۔ پہلی جنگِ عظیم میں فلسطین پر قبضہ کر کے لارڈ ایلنبی نے جو اعلان کیا تھا وہ آخر کس سے پوشیدہ ہے۔ اسی جذبے کے تحت فلسطین سے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دینے اور ان کی جگہ ایک دوسری قوم کو لا بسانے کا اہتمام کیا گیا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ دنیا کی کسی دوسری قوم کے ساتھ اتنا بڑا ظلم کیا گیا ہوتا تو امریکہ اور یورپ کے لوگ اِسی اطمینان کے ساتھ اس کو دیکھتے؟ ہندوستان کی تقسیم کے وقت جان بوجھ کر کشمیر جیسے مسلم اکثریت کے علاقے کو تحفے کے طور پر بھارت کے حوالے کیا گیا۔ اور اس کے بعد ۱۹ سال سے وہاں کی مسلم آبادی کے ساتھ جو ہولناک ظلم ہو رہا ہے اس پر اُن آنکھوں میں ایک آنسو تک نہ آیا جو ہنگری کے لیے کبھی رونے نہیں تھکتیں، حالانکہ ہنگری کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اس کو اُس ظلم سے کوئی نسبت نہیں ہے جو کشمیر میں ہو رہا ہے۔ اسی طرح قبرص کے ترکوں پر یونانی جو ظلم ڈھا رہے ہیں اہل مغرب کی ساری ہمدردیاں اس معاملے میں ترکوں کے ساتھ نہیں بلکہ یونانیوں کے ساتھ ہیں فرق اس کا یہ ہے کہ ظالم عیسائی ہیں اور مظلوم مسلمان۔ اِس معاملہ میں امریکہ نے اُس گہری دوستی کا بھی کوئی لحاظ نہ کیا جو ترکی اس کے ساتھ رکھتا تھا۔ افریقہ کے مختلف ملکوں میں جو ظلم، برطانیہ، فرانس، بلجیم، پرتگال اور دوسری عیسائی قوموں نے مسلمانوں پر کیا ہے اس کی تو کوئی نظیر مذہبی تعصب کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی۔ ان کی تہذیب کو مٹایا گیا۔ ان کی معاشی طاقت توڑی گئی۔ ان کو تعلیم سے محروم رکھا گیا اور کسی شخص کو اُس وقت تک تعلیم نہ دی گئی جب تک وہ عیسائی نہ ہو جائے یا کم از کم اپنا نام تبدیل کر کے عیسائی نام نہ رکھ لے۔ پھر فوج اور دیوانی نظم و نسق میں جن افریقیوں کو بھی جگہ دی گئی وہ زیادہ تر عیسائی تھے۔ اس کا نتیجہ آج یہ ہے کہ افریقہ کے نئے آزاد ملکوں میں بکثرت ملک جن کی اکثریت مسلمان ہے ان میں یا تو حکومت ہی عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے، یا اگر مسلمان اوپر آئے بھی ہیں تو ان کی فوج اور ان کے دیوانی نظم و نسق میں عیسائی اتنے طاقت ور ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت وہاں چلنی سخت دشوار ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو لوگ مذہبی تعصب ہی کی بنا پر دنیا میں ہر جگہ ظلم کے شکار ہوتے رہے ہوں اور آج بھی ہو رہے ہوں، وہ آخر اُسی مذہب کی بنیاد پر اپنے آپ کو ظلم سے بچانے کے لیے کیوں نہ متحد ہوں جس کی وجہ سے اُن کو تعصب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے؟ ظالموں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا ظلم پر متحد ہونا زیادہ معیوب ہے یا مظلوموں کا ظلم سے بچاؤ کے لیے متحد ہونا؟

اِن وجوہ سے مجھے اُن لوگوں پر سخت حیرت ہے جو مسلمان ممالک کے اتحاد کی مخالفت کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب کے نام پر ریاستوں کا جمع ہونا غلط ہے۔ اشتراکیت کے نام پر جمع ہو جانا صحیح۔ رنگ کی بنیاد پر جمع ہو جانا بھی صحیح۔ لیکن صرف خدا کے نام پر اور خدا کے دین کے نام پر جمع ہو جانا بہت بُری بات ہے۔ یہ منطق میری سمجھ سے بالکل باہر ہے۔ مَیں تو یہ سمجھتا ہُوں کہ ہمیں صرف اپنے دینی و ثقافتی اور معاشی مسائل کو حل کرنے، اور صرف اپنی مادّی و تمدنی ترقی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کے لیے ہی جمع نہ ہونا چاہیے بلکہ اپنے دفاع کو متحدہ کوشش سے مضبوط کرنے کے لیے بھی جمع ہونا چاہیے اور کم از کم یہ فکر تو ضرور کرنی چاہیے کہ مسلم ممالک خود اپنے ہاں اسلحہ سازی کی صنعت کو فروغ دیں تاکہ وہ اپنے دفاع کے لیے روس یا امریکہ یا برطانیہ سے ہتھیار نہ مانگتے پھریں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن

ضروری اعلان

مجھے ترجمان القرآن کے حسبِ ذیل پرچے مطلوب ہیں جن صاحب کے پاس ہوں وہ مجھے بھجوا دیں ان کی قیمت ادا کر دی جائے گی۔

جلد ۳۱	شمارہ	۶	اکتوبر ۱۹۴۸ء
" ۳۶	"	۱، ۲	مئی جون ۱۹۵۱ء
" ۳۷	"	۴	دسمبر ۱۹۵۱ء۔ جنوری ۱۹۵۲ء
" ۳۹	"	۱، ۲	اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء

صابر قریشی ناظمِ ادارہ بتول اچھرہ۔ لاہور

© rasailojaraid.com